

امامت ائمہ اطہار علیہم السلام کی نگاہ میں

<?xml encoding="UTF-8">

امامت کے کلی مسائل سے متعلق یہ ہماری آخری بحث ہے اس کے بعد ہم اس سلسلہ میں جو بحثیں کریں گے وہ احادیث و روایات کی روشنی میں ہوں گی۔ مثال کے طور پر وہ حدیثیں جو امیر المومنین (علیہ السلام) کے سلسلہ میں پیغمبر اکرم (ص) سے نقل ہوئی ہیں یا خود امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے بعد کے ائمہ علیہم السلام کے لئے ذکر فرمائی ہیں، یوں ہی حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان ائمہ علیہم السلام کے بارہ میں جو کچھ فرمایا ہے نیز یہ کہ ہر امام نے اپنے بعد ک امام کے لئے کس طرح وضاحت فرمائی ہے ہم ایک ایک کر کے ان سب کا جائزہ لیں گے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر روایات نقلی، تعینی و تنصیصی پہلو رکھتی ہیں۔

موجودہ بحث کچھ اس ڈھنگ کی ہے کہ اس کا کچھ حصہ شاید ہم گزشتہ گفتگو میں بھی متفرق طور پر پیش کرچکے ہیں لیکن چونکہ یہ مسئلہ امامت کی روح سے مربوط ہے لہذا اب ہم ائمہ معصومین علیہم السلام کے اقوال کی روشنی میں اس پر بحث کریں گے۔ اور کتاب "اصول کافی کی کتاب الحجۃ" کا ایک حصہ بھی آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔ ہم مکرر عرض کر چکے ہیں کہ امامت کے اس مفہوم ہم شیعہ یا کم از کم ائمہ علیہم السلام شیعہ کے اقوال میں پیش کیا گیا ہے وہ امامت کے اس مفہوم سے بالکل الگ ہے جو اہل سنت کے یہاں رائج ہے۔ یہ مسئلہ حکومت سے بالکل الگ ایک چیز ہے جس کا چرچا ہمارے زمانہ میں بہت ہوتا ہے۔ مثلاً، امامت بنیادی طور پر نبوت کے قدم بہ قدم یا اس کے بالکل دوش بدوش والا مسئلہ ہے لیکن اس معنی میں نہیں کہ اس کا مرتبہ ہر نبوت سے کمتر درجہ کا ہے۔ بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ نبوت سے مشابہ ایک ایسا منصب ہے جو بڑے انبیاء کو بھی عطا ہوا ہے یعنی یہ ایک ایسا معنوی منصب ہے کہ بڑے انبیاء نبوت کے ساتھ ساتھ امامت کے منصب پر بھی فائز رہے ہیں۔ ائمہ معصومین علیہم السلام نے کلی طور پر اس مسئلہ کے تحت اپنی گفتگو میں انسان کو بنیاد قرار دیا ہے۔ لہذا ہمیں پہلے انسان کے متعلق اپنے تصورات و خیالات پر تجدید نظر کرنا چاہیئے تاکہ یہ مسئلہ پورے طور سے واضح ہوسکے۔

انسان؟

آپ جانتے ہیں کہ اساسی طور پر انسان کے سلسلہ میں دو نظریے پائے جاتے ہیں ایک یہ کہ انسان بھی تمام جانداروں کے مانند صد فی صد ایک خاکی یا مادی وجود ہے۔ لیکن یہ ایسا مادی وجود ہے جو اپنے تغیرات کی راہ طے کرتے ہوئے اس حد کمال کو پہنچ چکا ہے جہاں تک زیادہ سے زیادہ مادہ میں اس کی صلاحیت پائی جاتی تھی۔ حیات، چاہے نباتات میں ہو یا اس سے بلند حیوانات میں یا ان سب سے بڑھ کر انسان میں، یہ خود مادہ کے تدریجی ارتقا و کمال کی نشان دہی کرتی ہے یعنی اس وجود کی بناوٹ اور ساخت میں مادی عناصر کے علاوہ کوئی اور عنصر کارفرما نہیں ہے۔ (یہاں عنصر کا لفظ اس لئے استعمال ہوا کہ اس کی کوئی دوسری تعبیر ہمارے پاس نہیں ہے)۔ جتنے حیرت انگیز آثار اس وجود میں پائے جاتے ہیں ان کا سرچشمہ یہی مادی تشکیل ہے۔ اس نظریہ کے مطابق قہری طور پر پہلے انسان کو یا دنیا میں آنے والے ابتدائی انسانوں کو ناقص ترین انسان ہونا چاہیئے اور جوں جوں یہ قافلہ انسانیت آگے بڑھا ہوگا انسان کامل تر ہوتا گیا، خواہ ہم اولین انسان کو قدما

کے تصور کے مطابق براہ راست خاک سے پیدا شدہ مانیں یا عہد حاضر کے بعض (سائنس دان) حضرات کے مفروضہ کے مطابق----- جو مفروضہ ہونے کی حیثیت سے قابل توجہ ہے کہ انسان اپنے آپ سے پست تر اور ناقص تر وجود [1] کی تعمیر یافتہ اور کامل شدہ مخلوق ہے۔ جس کی اصل و بنیاد مٹی تک پہنچتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ پہلا انسان براہ راست خاک سے خلق ہو گیا ہو۔

پہلا انسان

قرآن کی نظر میں لیکن اسلامی و قرآنی بلکہ تمام مذاہب کے اعتقادات کے مطابق پہلا انسان وہ وجود ہے جو اپنے بعد کے بہت سے انسانوں حتیٰ کہ آج کے انسانوں سے بھی زیادہ کامل ہے۔ یعنی پہلی بار جب اس انسان نے عرصہ عالم میں قدم رکھا، اسی وقت سے وہ خلیفہ اللہ یا دوسرے الفاظ میں پیغمبر کے درجہ پر فائز نظر آیا۔ دین کی منطق میں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ کیوں پہلا انسان ہی دنیا میں آیا تو ایک حجت خدا اور پیغمبر کی شکل میں آیا، جبکہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ انسان دنیا میں آتے رہتے اور ارتقائی منازل طے کرتے رہتے اور جب عالی مراحل و مراتب سے ہمکنار ہوتے تو ان میں سے کوئی ایک نبوت و پیغمبری کے منصب پر فائز ہوجاتا، نہ یہ کہ پہلا ہی انسان پیغمبر ہو۔

قرآن کریم پہلے انسان کے لئے بہت عظیم اور بلند درجہ کا قائل ہے:

"وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ" [2]

جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے فرمایا کہ میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں تو انہوں نے کہا (خدا یا) کیا تو انہیں روئے زمین پر اپنا خلیفہ بنائے گا جو زمین پر فساد و خونریزی برپا کریں اور ہم تو تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں (خداوند عالم نے) فرمایا، بلا شبہ (اس انسان کے اسرار کے بارے میں) جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے اور اللہ نے آدم علیہ السلام کو تمام اسماء تعلیم دیئے پھر ان کے حقائق ملائکہ کے سامنے بھی پیش کئے اور فرمایا ہمیں ان کے نام بتاؤ۔

مختصر یہ کہ جب پہلا انسان عالم وجود میں آیا تو اس ملائکہ کو بھی حیرت میں ڈال دیا کہ آخر اس میں کیا راز پنہاں ہے؟-----پہلے انسان کے بارے میں "نفخت فیہ من روحی" (اپنی روح اس میں پھونکی) کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس پیکر کی ساخت اور اس کے ڈھانچہ میں مادی عناصر کے علاوہ ایک غلوی عنصر بھی کارفرما ہے جو (اپنی روح) کی تعبیر کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کی جانب سے ایک خصوصی شئے اس وجود کے پیکر میں داخل ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اس لئے بھی کہ اس کو خلیفہ اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ "إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً" میں زمین پر اپنا خلیفہ بنارہا ہوں۔

بنابر ایس قرآن، انسان کو اس عظمت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ کہ پہلا انسان جب عالم وجود میں قدم رکھتا ہے تو حجت خدا و پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ایک ایسے وجود کے عنوان سے قدم رکھتا ہے جو عالم غیب سے رابطہ رکھتا ہو۔ ہمارے ائمہ علیہم السلام کے کلام کی اساس و بنیاد انسان کی اسی اصل و حقیقت پر ہے یعنی پہلا انسان جو اس زمین پر آیا اسی صنف کا تھا اور آخری انسان بھی جو اس زمین پر ہوگا اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہوگا اور عالم انسانیت کبھی بھی ایسے وجود سے خالی نہیں جس میں "إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً" کی روح پائی جاتی ہے۔ (بنیادی طور سے اس مسئلہ کا محور یہی ہے) دیگر تمام انسان، ایسے انسانی وجود کی

فرع کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اگر یہ انسان نہ ہو تو بقیہ تمام انسان کسی بھی صورت سے باقی نہیں رہیں گے۔ ایسے ہی انسان کو حجت خدا سے تعبیر کرتے ہیں:-

اللَّهُمَّ بَلِّ لَا تَخْلُوا لَارِضٍ مِّن قَائِمٍ لِّلْهِ بِحُجَّةٍ ہاں (مگر) زمین ایسی فرد سے خالی نہیں رہتی جو اللہ کی حجت ہے یہ جملہ نہج البلاغہ [3] میں ہے اور بہت سی کتابوں میں نقل ہوا ہے۔ میں نے یہ بات مرحوم آیۃ اللہ بروجردی سے سنی ہے، لیکن یہ یاد نہیں کہ میں نے خود اسے دوسری جگہ بھی کہیں دیکھا ہے یا نہیں، یعنی اس کی جستجو نہیں کی۔ آپ فرماتے تھے کہ یہ جملہ حضرت کے ان جملوں میں سے ہے جنہیں آپ نے بصرہ میں بیان فرمایا ہے او شیعہ و سنی دونوں نے اسے تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے۔ یہ جملہ مشہور حدیث کمیل کا ایک حصہ ہے۔ کمیل کا بیان ہے کہ ایک روز حضرت علی (علیہ السلام) نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے اپنے ہمراہ لے کر شہر کے باہر تشریف لائے۔ یہاں تک کہ ہم لوگ "جَبَّان" نامی ایک جگہ پر پہنچے۔ جیسے ہی ہم لوگ شہر سے خارج ہو کر سناٹے اور تنہائی میں آئے: **فَتَنَفَّسَ الصُّمَّعْدَاءُ** حضرت علیہ السلام نے گہری سانس لی، ایک آہ کھینچی اور فرمایا:-

" يَا كَمِيلُ! إِنَّ هَذِهِ الْقُلُوبَ أَوْ عِيَّةَ فَخَيْرُهَا أَوْ عَاهَا فَاحْفَظْ عَنِّي مَا أَقُولُ لَكَ "

" اے کمیل! اولاد آدم علیہ السلام کے دل ظرف کے مانند ہیں اور بہترین ظرف وہ ہے جو کسی چیز کو اپنے اندر محفوظ رکھے (یعنی اس میں سوراخ نہ ہو) لہذا میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں اسے محفوظ کر لو۔" پہلے آپ نے انسانوں کو تین گروہوں میں تقسیم فرمایا:-

" النَّاسُ ثَلَاثَةٌ: فَعَالِمٌ رَبَّانِيٍّ وَ مُتَعَلِّمٌ فِي سَبِيلِ نَجَاةٍ وَ هَمَجٌ رَّعَاً "

" انسان تین قسم کے ہیں: ایک گروہ علمائے ربانی کا ہے (البتہ حضرت علی (علیہ السلام) کی اصطلاح میں عالم ربّانی سے مراد ہر وہ عالم ربّانی نہیں ہے جو ہم ہر ایک کو تکلفاً کہہ دیا کرتے ہیں، بلکہ اس سے مراد ایسا عالم ہے جو واقعاً صد فی صد الہی ہو اور خالص خدا کے لئے عمل کرتا ہو اور شاید یہ تعبیر سوائے انبیاء و ائمہ علیہم السلام کے کسی اور پر صادق نہیں آتی) **" وَ مُتَعَلِّمٌ عَلَى سَبِيلِ نَجَاةٍ "** (چونکہ اس عالم کو اس متعلم کے مقابل میں ذکر کیا ہے لہذا اُس سے مقصود وہ عالم ہے جو کسی بشر سے علم حاصل نہیں کرتا) یہ دوسرا گروہ اُن سے علم حاصل کرنے والوں اور شاگردوں کا ہے۔ ان لوگوں کو ہے جو ان علماء سے استفادہ کرتے ہیں۔ تیسرے گروہ کے لوگ **" هَمَجٌ رَّعَاً "** ہیں (اس کی تشریح یہ ہے) کہ: **" لَمْ يَسْتَضِئُوا بِنُورِ الْعِلْمِ وَلَمْ يَلْجَأُوا إِلَى رُكْنٍ وَثِيقٍ "** جنہوں نے علم کے نور سے نہ کوئی روشنی حاصل کی ہے اور نہ کسی محکم ستون کا سہارا حاصل کیا ہے۔"

اس کے بعد آپ نے اہل زمانہ کا گلہ کرنا شروع کیا۔ فرمایا میں بہت سے علوم اپنے سینہ میں رکھتا ہوں۔ لیکن مجھے کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جس میں (انہیں حاصل کرنے کی) صلاحیت موجود ہو۔ آپ علیہ السلام نے لوگوں کی گروہ بندی کرتے ہوئے فرمایا، ایسے لوگ بھی ہیں جو زیرک اور عقلمند ہیں لیکن ایسے زیرک ہیں کہ جو کچھ حاصل کرتے ہیں اس سے اپنے لئے فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں یعنی دین کو اپنی دنیا کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ لہذا میں ان سے پرہیز کرنے پر مجبور ہوں۔ کچھ دوسرے افراد ہیں جو اچھے اور نیک تو ہیں لیکن احمق ہیں۔ وہ کچھ حاصل ہی نہیں کرتے یا اگر حاصل بھی کرتے ہیں تو ایک دم اُلٹا اور غلط مطلب سمجھ بیٹھتے ہیں۔ یہاں تک تو امام علیہ السلام کی گفتگو مایوسانہ رنگ لئے ہوئے ہے (کیونکہ اس سے اندازہ ہوتا ہے) کہ کوئی اہل موجود نہیں ہے۔ لیکن اس کے بعد فرماتے ہیں: **" اللَّهُمَّ بَلِّ..... "** نہیں ایسا بھی نہیں ہے کہ کوئی شخص موجود نہ ہو۔ میں تو یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں لوگوں کی اکثریت کو کہہ رہا ہوں (یہاں آقائے بروجردی

فرماتے تھے کہ حضرت علیہ السلام نے یہ اشارہ بصرہ میں ایک خطبہ کے ذیل میں فرمایا تھا، ورنہ یہ کمیل کے ساتھ ہونے والی گفتگو میں بھی موجود ہے۔

اَللّٰهُمَّ بَلِّیْ لَا تَخْلُوْا الْاَرْضَ مِنْ قَائِمٍ لِّلْهٖ بِحُجَّةٍ اِمَّا ظَاهِرًا مَّشْهُوْرًا وَّ اِمَّا خَائِفًا مَّغْمُوْرًا لِئَلَّا تَبْطُلَ حُجَّجُ اللّٰهِ وَ بَيِّنَاتُہٗ وَ کَمَّ ذَا وَاٰیْنٍ؟ اَوْ لَئِکَ وَاللّٰہِ۔ اَلْاَقْلُوْنَ عَدَدًا وَّ الْاَعْظَمُوْا نَ عِنْدَ اللّٰہِ قَدْ رَأٰ، یَحْفَظُ اللّٰہُ بِہُمْ حُجَّجَہٗ وَبَيِّنَاتَہٗ حَتّٰی یُوْ دَعُوْ ہَا نَظَرَاتُہُمْ وَیَزِ رَعُوْ ہَا فِی قُلُوْبٍ اَشْبَآہُہُمْ هَجَمَ بِہُمْ الْعِلْمُ عَلٰی حَقِیْقَۃِ الْبَصِیْرَۃِ وَبَا شَرُّوْا رُوْ حُ الْیَقِیْنِ وَاسْتَاَلْنَاوَا مَا اسْتَعْوَرَہُ الْمُتَرَفُّوْ نَ وَانْسُوْ ا بِمَا اسْتَوْ حِشْ مِنْہُ الْجَآہِلُوْنَ وَ صَحِبُوْا الدُّنْیَا بِاٰیْدَانٍ اَر وَاَحْہَا مُعَلَّقَۃٌ بِالْمَحَلِّ الْاَعْلٰی۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: ہاں، زمین ہر گز حجت خدا سے خالی نہیں ہے۔ اب چاہے یہ حجت ظاہر ہو اور لوگوں کے درمیان ہو یا مستور اور پوشیدہ یعنی موجود تو ہو، لیکن لوگ اسے دیکھ نہ پائیں، وہ نگاہ سے پوشیدہ ہو۔ ان ہی حجتوں کے ذریعہ خداوند عالم اپنی دلیلیں اور نشانیاں لوگوں کے درمیان محفوظ رکھتا ہے۔ اور یہ لوگ بھی جو کچھ جانتے ہیں اس کے بیچ اپنے ہی جیسے افراد کے دلوں میں بو دیتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ امانتیں ان کے حوالہ نہ کریں اور چلے جائیں یعنی ایسا نہیں ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے اسے بیان کئے بغیر چلا جاؤں گا۔ اس کے بعد حضرت علیہ السلام ان افراد سے متعلق جو ایک ملکوتی مبدأ و مرکز سے استفادہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں: **هَجَمَ بِہُمْ الْعِلْمُ عَلٰی حَقِیْقَۃِ الْبَصِیْرَۃِ** خود علم ان پر ہجوم کرتا ہے اور ٹوٹ کر برستا ہے۔ وہ علم کی طرف نہیں بڑھتے۔ (مطلب یہ ہے کہ ان کا علم تفویضی ہے) اور وہ علم جو ان پر ہجوم کرتا ہے، انہیں حقیقی معنوں میں بصیرت عطا کرتا ہے یعنی اس علم میں کوئی اشتباہ، نقص یا خطا نہیں پائی جاتی۔ **"وَبَا شَرُّوْا رُوْ حُ الْیَقِیْنِ"** وہ روح یقین کو متصل رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ عالم دیگر سے بھی ایک طرح کا ارتباط و اتصال رکھتے ہیں۔ **"وَاسْتَاَلْنَاوَا مَا اسْتَعْوَرَہُ الْمُتَرَفُّوْ نَ"** وہ چیزیں جنہیں مترف (یعنی اہل عیش و طرب) اپنے لئے بہت دشوار سمجھتے ہیں ان کے لئے آسان ہیں۔ مثلاً عیش و عشرت کے عادی افراد کا گھنٹہ بھر اپنے خدا سے لو لگانا اور اس سے راز و نیاز کی باتیں کرنا گویا سب سے زیادہ دشوار کام ہے۔ لیکن ان کے لئے یہ کام آسان ہی نہیں بلکہ ان کا پسندیدہ عمل ہے۔ **"وَانْسُوْ ا بِمَا اسْتَوْ حِشْ مِنْہُ الْجَآہِلُوْنَ"** جن چیزوں سے نادان اور جاہل افراد وحشت کرتے ہیں یہ ان سے مانوس ہیں۔ **"وَ صَحِبُوْا الدُّنْیَا بِاٰیْدَانٍ اَر وَاَحْہَا مُعَلَّقَۃٌ بِالْمَحَلِّ الْاَعْلٰی"**

اپنے جسموں کے ساتھ لوگوں کے ہمراہ رہتے ہیں جبکہ اسی وقت ان کی روحوں مقامِ اعلیٰ سے تعلق و اتصال رکھتی ہیں۔ یعنی ان کا جسم لوگوں کے ساتھ ہے لیکن ان کی روح یہاں نہیں ہے، جو لوگ ان کے ہمراہ ہیں انہیں اپنے ہی جیسا انسان سمجھتے ہیں اور ان میں اور اپنے آپ میں کوئی فرق نہیں سمجھتے، لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ اس (انسانِ کامل) کا باطن کسی اور عالم سے وابستہ ہے۔

بہر حال امامت کا اصل فلسفہ یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب "کافی" میں "باب الحجۃ" کے عنوان سے ایک مستقل باب موجود ہے۔ اور اس میں ملتا ہے کہ اگر دنیا میں صرف دو انسان باقی رہیں تو ان میں کا ایک اسی طرح کا انسان ہوگا جس طرح دنیا کا پہلا انسان اسی منصب پر فائز تھا ہم اس فلسفہ کی روح کو لوگوں کے ذہنوں سے مزید قریب کرنے کے لئے اور اس حقیقت سے زیادہ آشنا کرنے کے لئے "اصول کافی" سے "کتاب الحجۃ" کی بعض روایتیں اور حدیثیں آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اس مسئلہ سے متعلق تمام دوسرے مسائل مثلاً معاشرہ میں امام کا وجود ضروری ہے تاکہ وہ لوگوں پر عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرے، یا دینی امور میں لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کو حل کرسکے۔ یہ سب باتیں اس اصل مسئلہ میں طفیلی کی

حیثیت رکھتی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ امام کو لوگوں پر حکومت کرنے کے لئے امام قرار دیا جائے اور بس، بلکہ یہ مسئلہ ان تمام باتوں سے کہیں بالاتر ہے۔ یہ باتیں گویا امام کے "فوائد جاریہ" یعنی اس کے وجود کے نتیجہ میں مرتب ہونے والے فوائد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم ہر حدیث سے کچھ جملے منتخب کر کے آپ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں تاکہ فلسفہ امامت کی حقیقت پورے طور سے واضح ہو جائے۔

امام جعفر صادق (علیہ السلام) سے ایک روایت

یہ روایت انبیاء و مرسلین سے متعلق ہے۔ ایک زندیق (مادہ پرست) نے امام صادق (علیہ السلام) سے سوال کیا کہ: "مِنْ أَيْنَ اثْبَتَ الْأَنْبِيَاءَ وَالرُّسُلُ؟" آپ انبیاء علیہم السلام و رسل کو کس دلیل سے ثابت کرتے ہیں؟ امام نے جواب میں مسئلہ توحید کو بنیاد قرار دیتے ہوئے فرمایا:

"إِنَّا اثْبَتْنَا أَنَّ لَنَا خَالِقًا صَانِعًا مَتَعَالِيًا عَنَّا وَعَنْ جَمِيعِ مَا خَلَقَ وَكَانَ ذَلِكَ الصَّانِعُ حَكِيمًا مَتَعَالِيًا لَمْ يَجْزِ أَنْ يَشَاهِدَهُ خَلْقُهُ وَلَا يَلَا مَسُوهُ فَيُبَاشِرُهُمْ وَيُبَاشِرُوهُ وَيُحَاجَّهُمْ وَيُحَاجُّوهُ ثَبَتَ أَنَّ لَهُ سُفْرَاءَ فِي خَلْقِهِ يُعَبِّرُونَ عَنْهُ إِلَى خَلْقِهِ وَعِبَادِهِ وَيَذَلُّونَهُمْ عَلَى مَصَالِحِهِمْ وَمَنَافِعِهِمْ وَمَا بِهِ بَقَائُهُمْ وَفِي ثَرِّهِ فَنَائُهُمْ فَثَبَتَ الْأَمْرُ نَ وَالنَّاهُ نَ عَنِ الْحَكِيمِ الْعَلِيمِ فِي خَلْقِهِ".....

مختصر یہ ہے کہ انبیاء و رسل کے ثابت کرنے کی بنیاد، اپنی تمام الہی شان و صفات کے ساتھ خود اللہ کے اثبات پر موقوف ہے جب ہم نے یہ جان لیا کہ ہمارا کوئی خالق و صانع ہے جو حکیم ہے اور ہم سے اعلیٰ و ارفع ہے یعنی ہم اپنے حواس و ادراک کے ذریعہ اس سے براہ راست ارتباط پیدا نہیں کرسکتے۔ نہ اس کا مشاہدہ کرسکتے ہیں اور نہ اسے چھو سکتے ہیں اور نہ ہی اس سے دو بدو سوال و جواب کرسکتے ہیں جبکہ ہم اس کے محتاج ہیں کہ وہ ہماری راہنمائی کرے۔ کیونکہ فقط وہی حقیقی حکیم و دانا ہے اور ہمارے واقعی مصالح و مفادات سے آگاہ ہے۔ لہذا ایسے وجود کا ہونا ضروری ہے جو بیک وقت دو پہلوؤں کا حامل ہو: ایک طرف وہ خدا سے ارتباط رکھتا ہو یعنی اس پر وحی نازل ہوتی ہو اور دوسری طرف ہم اس سے رابطہ قائم کرسکتے ہوں۔ اور ایسے افراد کا ہونا لازم و واجب ہے۔

اس کے بعد امام علیہ السلام ان افراد کے بارہ میں فرماتے ہیں: "حُكَمَاءُ مُؤَدِّبِينَ بِالْحِكْمَةِ" خود ان لوگوں کو حکیم دانا ہونا چاہیئے۔ وہ حکمت کی بنیاد پر مؤدب و مہذب کئے گئے ہوں۔ "مبعوثین بہا" اور حکمت ہی پر مبعوث کئے گئے ہوں یعنی ان کی دعوت اور ان کا پیغام حکمت پر مبنی ہو۔ "عَبَّرَ مُشَارِكِينَ لِلنَّاسِ عَلَى مُشَارَكَتِهِمْ لَهُمْ فِي الْخَلْقِ"۔ اگر چہ وہ خلقت کے اعتبار سے انسانوں میں شریک ہوں لیکن بعض جہات میں لوگوں سے الگ اور جدا ہوں۔ ایک انفرادی پہلو اور امتیازی روح ان میں پائی جاتی ہو۔ "مُؤَيِّدِينَ مِنَ عِنْدِ الْحَكِيمِ الْعَلِيمِ بِالْحِكْمَةِ" خدا نے حکیم و علیم کی جانب سے حکمت کی بنیاد پر ان کی تائید کی گئی ہو۔ "ثُمَّ ثَبَتَ ذَلِكَ فِي كُلِّ دَهْرٍ وَمَكَانٍ" ایسے واسطوں اور ذریعوں کا وجود ہر زمانہ اور ہر عہد میں لازمی و ضروری ہے۔ "لِكَيْ لَا تَخْلُوا الْأَرْضَ مِنْ حُجَّةٍ يَكُونُ مَعَهُ عِلْمٌ يَدُلُّ عَلَى صِدْقِ مَقَالَتِهِ وَجَوَازِ عِدَالَتِهِ" تاکہ زمین کسی وقت بھی ایسی حجت سے خالی نہ رہے جس کے پاس اس کی صداقت گفتار اور اس کی عدالت و رفتار کے ثبوت میں کوئی علم (دلیل یا معجزہ) موجود ہو۔

زید بن علی علیہ السلام اور مسئلہ امامت

زید ابن علی ابن الحسین علیہ السلام امام محمد باقر (ع) کے بھائی ہیں اور صالح و محترم شخص ہیں۔ ہمارے ائمہ (علیہم السلام) نے آپ کی اور آپ کے مجاہدانہ اقدام کی تعریف کی ہے۔ اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ جناب زید واقعاً خود اپنے لئے خلافت کے مدعی تھے یا صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے رہے تھے اور خود خلافت کے دعویدار نہیں تھے بلکہ آپ امام محمد باقر (علیہ السلام) کی خلافت کے خواہاں تھے، یہ بہر حال مسلم ہے کہ ہمارے ائمہ (علیہم السلام) نے آپ کی تعریف و توصیف کی ہے اور آپ کو شہید کہا ہے۔ اور یہی ان کی عظمت کے لئے کافی ہے کہ: "مَضَى وَاللّٰهُ شَهِيدًا" وہ شہید ہو کر دنیا سے اٹھے لیکن بحث اس بات پر ہے کہ آپ خود اس مسئلہ (امامت) میں شبہ کا شکار تھے یا نہیں؟ جو روایت اس وقت میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ خود اس سلسلہ میں شبہ میں مبتلا تھے۔ اب یہ بات کہ ایسا شخص اس مسئلہ میں شبہ کا شکار کیسے ہوسکتا ہے۔ یہ ایک دوسری بحث ہے۔

امام محمد باقر (علیہ السلام) کے ایک صحابی ابو جعفر احوال بیان کرتے ہیں: جس وقت زید بن علی مخفی تھے انہوں نے میرے پاس پیغام بھیجا اور مجھ سے فرمایا کہ اگر ہم میں سے کوئی جہاد کے لئے قیام کرے تو کیا تم ہماری مدد کے لئے آمادہ ہو؟ میں نے جواب دیا اگر آپ کے پدر بزرگوار اور بھائی (حضرت امام زین العابدین علیہ السلام) اور امام محمد باقر (علیہ السلام) اجازت دیں تو میں حاضر ہوں ورنہ نہیں۔ زید نے فرمایا، میں خود قیام کا ارادہ رکھتا ہوں۔ بھائی سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ کیا اب بھی تم ہماری حمایت پر آمادہ ہو؟ میں نے عرض کیا نہیں۔ آپ نے پوچھا کیوں؟ کیا تم ہمارے سلسلہ میں اپنی جان سے دریغ کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: اِنَّمَا هِيَ نَفْسٌ وَاحِدَةٌ فَإِنَّ اللَّهَ فِي الْأَرْضِ حُجَّةٌ فَإِذَا لَمْ تَخْلُفْ عَنْكَ نَاجٍ وَالْخَارِجُ مَعَكَ هَالِكٌ وَإِنْ لَا تَكُنْ لِلَّهِ حُجَّةٌ فِي الْأَرْضِ فَالْخَارِجُ مَعَكَ سَوَاءٌ" میں ایک ہی جان رکھتا ہوں اور آپ بھی حجت خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ اگر زمین پر آپ کے علاوہ کوئی حجت خدا ہے تو جو شخص آپ کے ساتھ قیام کرے اس نے خود کو ضائع کیا بلکہ ہلاک ہوا اور جس نے آپ سے انکار کیا اس نے نجات پائی لیکن اگر زمین پر کوئی حجت خدا نہ ہو تو میں چاہے آپ کے ساتھ قیام کروں یا نہ کروں دونوں باتیں برابر ہیں۔

ابو جعفر احوال جانتے تھے کہ زید کا مقصد کیا ہے۔ لہذا وہ اس حدیث کے ذریعہ یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ اس وقت روئے زمین پر ایک "حجت" موجود ہے۔ اور وہ آپ کے بھائی امام محمد باقر (علیہ السلام) ہیں۔ آپ نہیں ہیں۔ یہاں روایت میں حضرت زید کی گفتگو کا خلاصہ یہ کہ ہے، تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی جبکہ امام کا فرزند ہوتے ہوئے اس نکتہ سے واقف نہیں ہوں اور میرے پدر بزرگوار نے بھی مجھے نہیں بتایا؟ کیا میرے بابا مجھے چاہتے نہیں تھے؟ خدا کی قسم میرے بابا مجھے اس قدر چاہتے تھے کہ مجھے بچپن میں دستر خوان پر اپنی آغوش میں بٹھاتے تھے اور اگر نوالہ گرم ہوتا تھا تو پہلے اسے ٹھنڈا کرتے تھے اس کے بعد کھلاتے تھے تا کہ میرا دہن نہ جلنے پائے وہ باپ جو مجھ سے اس قدر محبت کرتا تھا کہ اسے ایک لقمہ کے ذریعہ میرا دہن جلنا گوارہ نہ تھا۔ کیا اس نے اتنی اہم بات جسے تم سمجھے ہو، مجھے بتانے سے مضائقہ کیا تاکہ میں جہنم کی آگ سے محفوظ رہوں؟ (ابو جعفر احوال نے) جواب دیا۔ انہوں نے آپ کو جہنم کی آگ سے محفوظ رکھنے کے لئے ہی نہیں بتایا۔ چونکہ وہ آپ کو بہت چاہتے تھے اس لئے آپ کو نہیں بتایا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر میں کہہ دوں گا تو آپ انکار کریں گے اور جہنمی ہوجائیں گے چونکہ وہ آپ کی طبیعت کی تیزی سے واقف تھے لہذا آپ سے بتانا نہیں چاہا۔ اور یہی بہتر سمجھا کہ آپ لاعلمی کی حالت پر باقی رہیں تاکہ کم از کم آپ میں

عناد نہ پیدا ہونے پائے لیکن یہ بات مجھ سے فرمادی تاکہ اسے قبول کر کے نجات حاصل کرلوں یا انکار کر کے جہنمی بن جاؤں۔۔۔ اور میں نے بھی اسے قبول کر لیا۔

اس کے بعد میں نے زید سے دریافت کیا: "أَنْتُمْ أَفْضَلُ أَمِ الْأَنْبِيَاءُ" آپ افضل ہیں یا انبیاء؟ فرمایا انبیاء۔ "قُلْتُ يَقُولُ يَعْقُوبُ لِيُوسُفَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَى إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا" میں نے عرض کیا یعقوب علیہ السلام جو پیغمبر ہیں اپنے بیٹے یوسف علیہ السلام سے جو خود بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے جانشین ہیں، کہتے ہیں کہ اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا۔ آیا یعقوب علیہ السلام کا یہ حکم یوسف علیہ السلام کے بھائیوں سے دشمنی کی بنا پر تھا یا ان کی اور یوسف علیہ السلام کی دوستی کی بنیاد پر تھا چونکہ وہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی طبیعت سے واقف تھے کہ اگر وہ سمجھ گئے کہ یوسف علیہ السلام اس مقام و منزلت پر فائز ہونے والے ہیں تو ابھی سے ان کی دشمنی پر کمر بستہ ہو جائیں گے۔ آپ کے ساتھ آپ کے پدر بزرگوار اور بھائی کا قصہ بالکل یعقوب علیہ السلام و یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں جیسا ہے۔ گفتگو کے اس مرحلہ پر آکر زید بالکل خاموش ہو گئے اور کچھ جواب نہ دے سکے۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے فرمایا: "أَمَّا وَاللَّهِ لَإِنْ قُلْتُ ذَلِكْ" اب جبکہ تم مجھ سے یہ بات کہہ رہے ہو تو میں بھی تمہیں یہ بتادوں کہ: لَقَدْ حَدَّثَنِي صَاحِبُكَ بِالْمَدِينَةِ "تمہارے آقا (یہاں مراد امام ہیں تمہارے امام یعنی میرے بھائی امام محمد باقر (علیہ السلام) نے مدینہ میں مجھ سے فرمایا: "أَنِي أَقْتُلُ وَأُصَلِّبُ بِالْكَنَاسَةِ" کہ تمہیں قتل کیا جائے گا اور کانسہ کوفہ پر سولی دی جائے گی۔ "وَأَنَّ عِنْدَهُ لَصَحِيفَةً فِيهَا قَتْلِي وَصَلْبِي" اور ان کے پاس ایک صحیفہ (کتاب) ہے جس میں میرے قتل کئے جانے اور دار پر چڑھائے جانے کا ذکر ہے۔

یہاں زید، ابوجعفر کے سامنے ایک دوسرا ورق الٹتے ہیں کیونکہ یک بیک بات ایک دم بدل جاتی ہے اور وہ دوسرے نظریہ کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس سے قبل جو باتیں آپ ابوجعفر سے فرما رہے تھے گویا اس سے اپنے آپ کو پنہاں رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ ابوجعفر مسئلہ امامت کے سلسلہ میں اس قدر راسخ الاعتقاد ہیں تو خود سے فرمایا کہ کہ ان کو بتادوں کہ میں بھی اس نکتہ سے غافل نہیں ہوں۔ وہ کہیں شبہ کا شکار نہ ہوں، میں بھی اس مسئلہ کو نہ صرف جانتا ہوں بلکہ اس کا اعتراف و اعتقاد بھی رکھتا ہوں۔ گفتگو کے آخری جملہ میں اسی مطلب کا اظہار ہے کہ میں پورے علم و ارادہ کے ساتھ نیز اپنے بھائی کے حکم سے جہاد کے لئے اٹھ رہا ہوں۔ یہاں تک کہ (ابو جعفر) کہتے ہیں کہ اس گفتگو کے بعد ایک سال میں مکہ مکرمہ گیا اور وہاں میں نے یہ پورا واقعہ حضرت امام صادق (علیہ السلام) سے بیان کیا۔ حضرت نے بھی میرے نظریات کی تائید کی۔

حضرت امام صادق (علیہ السلام) سے دو اور حدیثیں

امام علیہ السلام ایک دوسری حدیث میں فرماتے ہیں: "إِنَّ الْأَرَضَ لَا تَخْلُوْا لَهَا وَفِيهَا إِمَامٌ" زمین کبھی بھی امام سے خالی نہیں رہتی۔ نیز حضرت علیہ السلام سے ایک اور حدیث نقل ہے: "لَوْ بَقِيَ اثْنَانِ لَكَانَ أَحَدُهُمَا الْحُجَّةُ عَلَى صَاحِبِهِ" اگر روئے زمین پر دو شخص بھی باقی رہیں تو ان میں کا ایک اپنے ساتھی پر خدا کی حجت ہوگا۔

حضرت امام رضا (علیہ السلام) سے ایک روایت

اس سلسلہ میں ہمارے یہاں بہت سی حدیثیں موجود ہیں۔ ایک مفصل روایت جو امام رضا (علیہ السلام) سے

مروی ہے ملاحظہ فرمائیں۔ عبد العزیز بن مسلم کا بیان ہے کہ: "كُنَّا مَعَ الرَّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ بِمَرَوْ فَاجْتَمَعْنَا فِي الْجَامِعِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فِي بَدْءِ مَقَدِّمِنَا" ہم مرو میں امام رضا علیہ السلام کے ہمراہ تھے (یہ اس سفر کی بات ہے جب امام علیہ السلام ولی عہدی کے سلسلہ میں خراسان لے جائے جارہے تھے) جمعہ کے دن ہم مرو کی جامع مسجد میں بیٹھتے تھے اور امام جماعت موجود نہیں تھا لوگ جمع ہو کر مسئلہ امامت گفتگو کر رہے تھے۔ اس کے بعد وہاں سے اٹھ کر امام کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے ساری باتیں بیان کر دیں۔ امام نے تمسخر آمیز تبسم فرمایا کہ آخر یہ لوگ کیا سوچتے ہیں! یہ لوگ دراصل موضوع (امامت) کو ہی نہیں سمجھتے اس کے بعد امام نے فرمایا: "جَهْلُ الْقَوْمِ وَخُدْعَا عَنْ أَرَائِهِمْ" یہ لوگ جاہل ہیں اور انہوں نے اپنے افکار و عقائد میں دھوکہ کھایا ہے خداوند عالم نے اپنے پیغمبر (ص) کو اس وقت تک نہیں اٹھایا جب تک دین کامل نہیں ہوا۔ اس نے قرآن نازل فرمایا جس میں حلال، حرام، حدود و احکام اور وہ تمام باتیں جن کی دین کے سلسلہ میں انسان کو ضرورت ہے سب بیان کر دی اور اعلان کر دیا: "مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ" ہم نے اس کتاب (قرآن مجید) میں کسی بھی چیز کو نہیں چھوڑا ہے یعنی سب کچھ بیان کر دیا ہے (اس سے مراد حلال و حرام سے متعلق قرآن کے احکام اور انسانوں کے تمام فرائض ہیں) اپنی حیات طیبہ کے آخری ایام میں پیغمبر اسلام (ص) نے حجۃ الوداع کے موقع پر اس آیت کی تلاوت بھی فرمائی: "الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا" یعنی آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں اور تمہارے لئے اسلام سے راضی ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت امام رضا (علیہ السلام) نے فرمایا: "وَأَمْرُ الْإِمَامَةِ مِنْ تَمَامِ الدِّينِ" اور مسئلہ امامت دین کو تمام اور کامل کرنے والے مسائل میں سے ایک ہے "وَلَمْ يَمْضِ حَتَّى بَيَّنَّ لِأُمَّتِهِ مَعَالِمَ دِينِهِمْ" پیغمبر اسلام (ص) اس وقت تک تشریف نہیں لے گئے جب تک انہوں نے اپنی امت کے درمیان ہدایت کی نشانیوں کو بیان نہ کر دیا اور ان کے لئے دین کی راہ روشن نہ کر دی۔ "وَأَقَامَ لَهُمْ عَلِيًّا عِلْمًا" اور ان کے لئے علی (علیہ السلام) کو راہنما مقرر فرمادیا۔

مختصر یہ کہ قرآن پوری صراحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ ہم نے کسی بھی امر کو فراموش نہیں کیا۔ اب یہ کہ کیا اس نے تمام جزئیات..... بھی بیان کر دیئے؟ یا نہیں: بلکہ فقط کلیات اور اصول بیان کئے ہیں اور ان چیزوں کا ذکر کیا ہے جن کی لوگوں کو ضرورت تھی۔ ان ہی کلیات و اصول میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ قرآن نے (پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد کے لئے) ایک ایسے انسان کا تعارف کروا دیا جو قرآن کی تفسیر اس کے معانی کی وضاحت نیز اس کے کلیات کی تشریح سے واقف ہے۔ اس کا یہ علم اجتہاد کی بنیاد پر نہیں ہے۔ جس میں کچھ باتیں صحیح ہوں اور کچھ غلط (بلکہ وہ علم الہی کے ذریعہ ان چیزوں سے آگاہ ہے) اور حقیقت اسلام اس کے پاس محفوظ ہے۔ پس قرآن یہ جو کہتا ہے کہ ہم نے تمام چیزیں بیان کر دیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اب کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی۔ ہم نے کلیات کے ساتھ ساتھ جزئیات بھی بیان کر دیئے ہیں اور انہیں ایک "دانا" کے پاس محفوظ کر دیا ہے۔ اور ہمیشہ اسلام سے آگاہ ایک شخص لوگوں کے درمیان موجود رہتا ہے۔ "مَنْ زَعَمَ أَنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ لَمْ يُكْمِلْ دِينَهُ فَقَدْ زَدَ كِتَابَ اللَّهِ" اگر کوئی شخص یہ کہے کہ خداوند عالم نے اپنا دین کامل نہیں کیا تو اس نے قرآن کے خلاف بات کہی ہے اور جو بھی قرآن کو رد کرے کافر ہے۔ "وَهَلْ يَعْرِفُونَ قَدْرَ الْإِمَامَةِ وَمَحَلَّهَا مِنَ الْأَمَةِ فَيَجُوزُ فِيهَا اخْتِيَارُهُمْ" جو لوگ کہتے ہیں کہ امامت انتخابی ہے کیا وہ جانتے بھی ہیں کہ امام کے کیا معنی ہیں؟ ان لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ امام کا انتخاب کسی سپہ سالار لشکر کے انتخاب کے مانند ہے، جب کہ امام وہ ہے کہ (جس کی تعیین پر) قرآن فرماتا ہے کہ میں نے دین کامل کر دیا۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اسلام کے جزئیات قرآن میں نہیں ہیں۔ حقیقت اسلام اس (امام) کے پاس ہے۔ کیا لوگ

سمجھتے ہیں کہ ایسا شخص کون ہے کہ خود اسے منتخب کرلیں؟ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے کہا جائے کہ پیغمبر(ص) کا انتخاب ہم خود ہی کرتے ہیں!

"إِنَّ الْإِمَامَةَ أَجَلٌ قَدَرًا وَأَعْظَمُ شَأْنًا وَأَعْلَى مَكَانًا وَأَمْنٌ جَانِبًا وَأَبْعَدُ غَوْرًا مِنْ أَنْ يَبْلُغَهَا النَّاسُ بِعُقُولِهِمْ أَوْ يَنَالُوا هَآبَارَهُمْ"۔ امامت انسان کی فکری حدود سے اس سے کہیں بالاتر ہے کہ اسے انتخابی قرار دیا جائے اسی مسئلہ کو انتخابی کہا جانا چاہئے جسے لوگ واقعی طور پر تشخیص دے سکیں، جن مسائل میں انسان خود تشخیص کی صلاحیت رکھتا ہے وہاں دین کبھی براہ راست مداخلت نہیں کرتا۔ اور بنیادی طور پر ایسے مسائل میں دین کی براہ راست مداخلت بالکل غلط ہے، کیونکہ ایسی صورت میں سوال اٹھے گا کہ پھر انسان کی فکر و عقل آخر کہاں کام آئے گی؟ جہاں تک انسانی فکر و عقل کا دائرہ ہے انسان خود انتخاب کریں لیکن جو بات عقل و بشر کی حد سے خارج اور بالاتر ہے۔ اس میں انتخاب کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ (امامت) قدر و منزلت کے اعتبار سے بہت بلند، شان کے اعتبار سے بہت عظیم، مرتبہ کے اعتبار سے بہت عالی ہے، اس کی دیواریں ناقابل عبور ہیں اور وہ عقل و فکر کی حد سے باہر ہے۔

"انسان اپنی عقل کے ذریعہ امام کو درک نہیں کرسکتے اور نہ اس تک اپنی آراء کے ذریعہ رسائی حاصل کرسکتے ہیں اور نہ اپنے اختیار سے اس کا انتخاب کرسکتے ہیں" إِنَّ الْإِمَامَةَ خَصَّ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ بِهَا إِبْرَاهِيمَ الْخَلِيلَ بَعْدَ النَّبِيِّ وَالْخَلَّةِ اگر امامت کے حقیقی معنی سمجھنا چاہتے ہو تو یہ جان لو کہ (امامت) ان تمام مسائل سے الگ ہے جن کا آج لوگ اظہار کرتے ہیں کہ پیغمبر(ص) کا ایک خلیفہ و جانشین منتخب کریں، لیکن یہ جانشین پیغمبر(ص) صرف لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کرے۔ امامت تو اصل میں وہ منصب ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جیسا پیغمبر(ص) نبوت کے بعد اس تک رسائی حاصل کرتا ہے اور اس منصب پر فائز ہونے کے بعد مسرت کا اظہار کرتے ہوئے خدا کی بارگاہ میں عرض کرتا ہے "وَمِنْ ذُرِّيَّتِي" خداوند میری ذریت میں سے کچھ افراد کو بھی یہ منصب عطا فرما۔ ابراہیم علیہ السلام جانتے ہیں کہ یہ عظیم منصب ان کی تمام ذریت کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ جواب دیا جاتا ہے "لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ" یہ وہ منصب ہے جو ظالم کو نہیں مل سکتا۔ ہم عرض کرچکے ہیں کہ یہاں سوال اٹھتا ہے کہ اس سے مراد کیا ہے؟ کیا ظالم ہر حال میں ظالم ہے چاہے ماضی میں وہ ظالم رہا ہو یا پہلے نیک اور صالح رہا ہو کیونکہ کہ یہ محال ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کہیں، خدا یا (یہ منصب) میری ذریت میں سے ظالموں کو عطا فرما۔ پس بھر حال ان کی نظر میں آپ کی نیک اور صالح اولاد ہی رہی ہے۔ چنانچہ خداوند عالم کی طرف سے جواب ملا کہ یہ منصب آپ کی ذریت میں سے ان کو عطا ہوگا جن کا ظلم سے سابقہ نہ رہا ہو۔

"فَأَبْطَلَتْ هَذِهِ الْآيَةُ إِمَامَةَ كُلِّ ظَالِمٍ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَصَارَتْ فِي الصَّفْوَةِ" یہ منصب ان منتخب افراد میں ہے یعنی ذریت حضرت ابراہیم علیہ السلام میں اہل صفوة (منتخب اور بہترین افراد کو عطا ہوا ہے۔) (صفوة یعنی مکھن کے مانند ایک ایسی چیز جسے مٹھا مہ کر اوپر سے نکال لیتے ہیں اور وہی "زبدہ" کہلاتا ہے)۔ "ثُمَّ أَكْرَمَهُ اللَّهُ تَعَالَى بِأَنْ جَعَلَهَا فِي ذُرِّيَّتِهِ أَهْلَ الصَّفْوَةِ وَالطَّهَارَةِ" (اس کے بعد خداوند عالم نے امامت کو بزرگ و مکرم بنایا اور وہ اس عنوان سے کہ اسے) صفوة اور اہل طہارت یعنی ذریت ابراہیم میں صاحبان عصمت کا حصہ قرار دیا۔ اس کے بعد امام (علیہ السلام) قرآن کی آیات سے استدلال فرماتے ہیں:

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ وَجَعَلْنَاهُمْ أئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ [4] اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحق علیہ السلام و یعقوب علیہ السلام جیسے فرزند عطا کئے اور ہم نے ان سب کو نیکو کار و صالح (نبی) قرار دیا۔ اور ان کو لوگوں کا ہادی و پیشوا قرار دیا کہ ہمارے حکم سے

لوگوں کی ہدایت کرتے تھے، اور ہم نے ان کی طرف نیک اعمال بجالانے کی وحی کی۔
قرآن مجید میں اس نکتہ پر کافی زور دیا گیا ہے کہ ذریت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منصب امامت سے نوازا گیا ہے۔

اس کے بعد امام (علیہ السلام) فرماتے ہیں: **فَمِنْ أَيْنَ يَخْتَارُ هَؤُلَاءِ الْجُهَالُ** "آخر وہ مقام و منصب جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبوت کے بعد عطا ہوا، یہ نادان اسے آخر کس طرح انتخاب کرنا چاہتے ہیں؟ کیا بنیادی طور پر یہ منصب انتخاب کے ذریعہ حاصل بھی کیا جاسکتا ہے؟!" **إِنَّ الْأَمَامَةَ هِيَ مَنْزِلَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَارِثُ الْأَوْصِيَاءِ** "امامت در اصل مقام انبیاء اور میراث اوصیاء ہے۔ یعنی یہ ایک وراثتی امر و منصب ہے لیکن قانونی میراث کے عنوان سے بلکہ اس اعتبار سے کہ اس کی استعداد و صلاحیت ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوئی ہے۔" **إِنَّ الْأَمَامَةَ خِلَافَةُ اللَّهِ** "امامت خلافت الہی ہے جو سب سے پہلے آدم علیہ السلام کو عطا ہوئی" **وَخِلَافَةُ الرَّسُولِ** "اور خلافت پیغمبر ہے۔ اس کے بعد امام فرماتے ہیں: **إِنَّ الْإِمَامَةَ زِمَامُ الدِّينِ**..." "امامت زمام دین، نظام مسلمین، صلاح و فلاح دنیا، عزت مسلمین، اسلام کی اصل و اساس اور اس کا بنیادی تنا ہے۔" **بِالْإِمَامِ تَمَامُ الصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَالصِّيَامِ وَالْحَجِّ وَالْجِهَادِ**... تا آخر۔ یعنی امام ہی کے ذریعہ نماز، زکوٰۃ، روزہ حج، جہاد اور دیگر اسلامی احکام و اوامر کامل ہوتے ہیں۔

نتیجہ

مذکورہ بالا تمام باتوں سے ایک اساسی و بنیادی منطق ہمارے ہاتھ آتی ہے۔ ہاں اگر بالفرض کوئی اسے بھی قبول نہ کرے تو اور بات ہے۔ یہ منطق ان سطحی و معمولی مسائل سے بالکل الگ کہ اکثر متکلمین کی طرح ہم یہ کہیں کہ پیغمبر اسلام (ص) کے بعد ابوبکر خلیفہ ہوئے اور علی (علیہ السلام) چوتھے خلیفہ ہوئے۔ آیا علی علیہ السلام کو پہلا خلیفہ ہونا چاہیئے یا مثلاً چوتھا؟ آیا ابوبکر میں امامت کے شرائط پائے جاتے تھے یا نہیں؟ اس کے بعد ہم شرائط امامت کو مسلمانوں کی حاکمیت کے عنوان سے دیکھنا اور پرکھنا شروع کریں۔ البتہ یہ بھی ایک بنیادی و اساسی مطلب ہے۔ اور شرائط حاکمیت کے اعتبار سے بھی شیعوں نے اعتراضات کئے ہیں اور بجا اعتراضات کئے ہیں۔ لیکن اصولی طور پر مسئلہ امامت کو اس انداز سے بیان کرنا ہی صحیح نہیں ہے کہ ابوبکر میں امامت کے شرائط پائے جاتے تھے یا نہیں۔ اصل میں خود اہل سنت بھی ان کے لئے اس منصب کا اقرار نہیں کرتے۔

اس سلسلہ میں اہل سنت کے عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام و ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک خداوند عالم نے ان افراد سے متعلق انسان کے جتنے ماوراء الطبیعی پہلوؤں کا ذکر کیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تمام ہو گئے۔ پیغمبر اکرم (ص) کے بعد اب تمام انسان معمولی اور ایک جیسے ہیں۔ اب صرف علماء ہیں جو پڑھنے لکھنے کے بعد عالم ہوئے ہیں اور ان سے کبھی غلطی ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی۔ یا حکام ہیں جن میں سے بعض عادل ہیں اور بعض فاسق۔ اب یہ مسئلہ امامت ان ہی کے درمیان دائر ہوتا ہے۔..... اب وہ باب جو ہمارے یہاں حجت الہیہ کے نام سے پایا جاتا ہے، یعنی وہ افراد جو عالم ماوراء الطبیعیہ یا عالم بالا سے ارتباط رکھتے ہیں، (ان کے یہاں نہیں پایا جاتا، ان کا عقیدہ ہے کہ) پیغمبر اکرم (ص) کے بعد وہ بساط ہی لپیٹ دی گئی ہے۔

شیعہ جواب دیتے ہیں کہ (پیغمبر اکرم (ص) کے بعد) رسالت کا مسئلہ ختم ہو گیا۔ اب کوئی دوسرا انسان کوئی نیا دین و آئین لے کر نہیں آئے گا۔ دین ایک سے زیادہ نہیں ہے اور وہ ہے اسلام، پیغمبر اکرم (ص) کے ساتھ

رسالت و نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لیکن حجت اور انسان کامل کا مسئلہ اور اس کی ضرورت انسانوں کے درمیان ہرگز تمام نہیں ہوئی ہے، کیونکہ روئے زمین پر پہلا انسان اس طرح کا تھا اور آخری انسان بھی ان ہی صفات کا نمونہ ہونا چاہیئے۔ اہل سنت میں صرف صوفیا کا طبقہ ایسا ہے جو ایک دوسرے نام سے سہی، اس مطلب کو تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صوفیائے اہل سنت اگرچہ صوفی ہیں لیکن جیسا کہ ان کے بعض بیانات سے ظاہر ہوتا ہے انہوں نے مسئلہ امامت کو اسی عنوان سے قبول کیا ہے۔ جیسے شیعہ مانتے ہیں۔ محی الدین عربی، اندلس کا رہنے والا ہے۔ اور اندلس وہ جگہ ہے جہاں کے رہنے والے نہ صرف سنی تھے بلکہ شیعہوں سے عناد بھی رکھتے تھے اور ان میں ناصبیت کی بو پائی جاتی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ اندلس کو امویوں نے فتح کیا اور بعد میں برسہا برس وہاں ان کی حکومت رہی۔ اور چونکہ یہ لوگ بھی اہل بیت علیہم السلام کے دشمن تھے لہذا علمائے اہل سنت میں زیادہ تر ناصبی علماء اندلسی ہیں شاید اندلس میں شیعہ ہوں بھی نہیں اور اگر ہوں گے بھی تو بہت کم اور نہ ہو نے کے برابر ہوں گے۔

بہر حال یہ محی الدین اندلسی ہے، لیکن اپنے عرفانی ذوق کی بنا پر وہ اس بات کا معتقد ہے کہ زمین کبھی کسی ولی یا حجت سے خالی نہیں رہ سکتی۔ یہاں وہ شیعہ نظریہ کو قبول کرتے ہوئے ائمہ علیہم السلام کے ناموں کا ذکر کرتا ہے، یہاں تک کہ حضرت حجت علیہ السلام کا نام بھی لیتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے سن چھ سو کچھ ہجری میں حضرت محمد علیہ السلام بن حسن عسکری علیہ السلام سے فلاں مقام پر ملاقات کی ہے۔ البتہ بعض باتیں اس نے ایسی کہی ہیں جو اس کی ایک دم ضد ہیں اور وہ بنیادی طور پر ایک متعصب سنی ہے لیکن اس کے باوجود چونکہ اس کا ذوق عرفانی تقاضہ کرتا ہے کہ صوفیوں کے مطابق زمین کبھی کسی "ولی" (اور ہمارے ائمہ علیہم السلام کے مطابق حجت) سے خالی نہیں رہ سکتی، اس مسئلہ کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ مشاہدہ و ملاقات کا دعویٰ کرتے ہوئے یہ بھی کہتا ہے کہ میں حضرت محمد بن عسکری علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ چکا ہوں، اور اس وقت جبکہ ان کی عمر تین سو کچھ برسوں سے زیادہ ہو چکی ہے اور وہ مخفی ہیں، میں ان کی زیارت سے شرفیاب ہوا ہوں۔

[1] ڈارون کا مشہور نظریہ۔ انسان پہلے بندر تھا (مترجم)

[2] سورہ بقرہ۔ آیات ۳۰۔ ۳۱۔

[3] نہج البلاغہ، فیض الاسلام، حکمت نمبر ۱۲۹۔ مطابق نہج البلاغہ مترجم مفتی جعفر حسین مرحوم، حکمت

۱۲۷

[4] سورہ انبیاء، آیت نمبر ۷۲۔ ۷۳